فہمیدہ ریاض کی نظم کا تہذیبی و لسانی جائزہ ("دھوپ" کے تناظر میں)

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین
(شعبۂ اُردو، جامعۂ پشاور)
ڈاکٹر اتنل ضیاء
(شعبۂ اُردو، جامعۂ شہید بے نظیر بھٹو برائے خواتین، پشاور)

Abstract:

Fehmida Riaz was born on 28th of July, 1945 in Meerut UP India and shifted to Pakistan after her father transfer to Hyderabad Sindh. She is a well-known Urdu writer and poet and famous for strong feminist and anti-establishment leanings. She had started writing at a very young age and managed her own Urdu Publication named "Awaz", which was later on banned by the government for its revolutionary vision and liberal view.
Civilization is said to be a complex human society, usually made up of different countries / cities, with certain characteristics of cultural and technological development. The undergo research article is based on analysis of civilization in Fehmida Riaz poetry (Nazm) in the light of her book "Dhoop".

Key Words. Dhoop, Myth, Shah Muhammad Mrree, Sunskrit, Pakistan, Hindstan,

تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور سماجی اقدار کی نمائندگی کرتی ہے۔ زبان، سماجی رشتے، رہن سہن، فنونِ لطیفہ، رسم و رواج، اخلاقی عادات اور عشق و محبت کے رویے تہذیب کے عناصر میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح ماحول اور موسم بھی کسی علاقے کی تہذیب کے اہم عوامل ہیں۔ شاعر اور ادیب چونکہ معاشرے کے حساس ترین افراد ہوتے ہیں، اس لئے یہ عناصر ان کی تخلیقات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض ایک بالغ النظر، کثیر جہتی شاعرہ اور بہت ہی تخلیقی آرٹسٹ ہے۔ فہمیدہ نے زندگی کو برتا ہے اور برت کر صفحۂ قرطاس پر اُتارا ہے۔ اس کے ہاں زندگی کے تلخ تجربات شاعری کے فنی حسن میں ڈھل گئے ہیں۔

فہمیدہ ریاض اپنی شاعری میں ایک ایسی عورت کے روپ میں ڈھل گئی ہے جس کی جھڑیں اپنی تہذیب اور روایات سے وابستہ ہیں۔ اس نے عورت کے نسائی پن کو پیکرِ شعر میں تراشا تو اس کے ساتھ ساتھ رسم و رواج اور تہذیبی رنگینی کو بھی نظم کے ڈھانچے میں سمویا۔ انسانی ثقافت اور کلچر تہذیب کے ایسے حوالے ہیں جو فہمیدہ ریاض کی نظم میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جب ہم تہذیب کی بات کرتے ہیں تو اس کا تعلق انسان کے ظاہری رکھ رکھاؤ، طور طریقے اور حسن و آراستگی سے ہے۔ علم و فن کے اکتساب سے فرد اپنی

پوشیدہ صلاحیتوں کے اظہار کا راستہ تلاشتا ہے۔ تہذیب کے حوالے سے سبط حسن لکھتے ہیں۔

"تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔"[1]

تہذیب ایک زندہ اکائی ہے جو فرد اس کی معاشرت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ تہذیب مقام کے قید سے آزاد ہوتی ہے۔ اس میں معاشرے اور اجتماعی تخلیقات اور اقدار کا نچوڑ ہوتا ہے۔ تہذیب ارتقا پذیر ہوتی ہے اور ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کچھ یوں رقم طراز ہوتے ہیں۔

"تہذیب معاشرے ہی میں نشو نما پاتی ہے اور ایک ایسے ورثے کی حیثیت رکھتی ہے جو پرانی نسل سے نئی نسل کو منتقل ہوتا ہے۔ جس میں تین مرحلے ہیں تحصیل، تفصیل اور تفویض۔ نئی نسل ماقبل سے تہذیبی فضائل کی تحصیل کرتی ہے، پھر ماحصل کو مفصل بنانے کی خاطر اس کی تفصیل کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔"[2]

پُرانی نسل سے اکتساب کے ساتھ ساتھ نئی نسل کو ترسیل کرنا بھی تہذیب کے عناصر میں شامل ہے۔ فہمیدہ ریاض نے اپنی نظم میں پرانی نسل سے ورثہ میں الفاظ کے ساتھ ساتھ روایات، اقدار اور معاشرت کا شعور بھی حاصل کیا ہے اور موجودہ وقت کے احساس کو بھی اپنی شاعری میں جذبات و کیفیات کی صورت میں ترسیل کا وسیلہ بنایا ہے۔ اس طرح وہ تہذیبی ارتقا کے عمل میں محرک شاعرہ کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ جب ہم تہذیب پر بات کرتے ہیں تو مظاہرِ تہذیب میں زبان، الفاظ، اخلاق و عادات، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات اہم ہیں۔ اس حوالے سے فہمیدہ ریاض کی کتاب "دھوپ" کی نظموں میں ہندی الفاظ کا استعمال ایک تہذیبی تسلسل کا غماز ہے۔ شاہ محمد مری "دھوپ" کے بارے میں کچھ یوں رقمطراز ہوتے ہیں۔

"یہ مجموعہ زبان کے لحاظ سے ایک بڑا موڑ مڑتی نظر آتی ہے۔ اس مجموعے میں اس کی اردو میں ہندی کے الفاظ زیادہ اور تکرار کے ساتھ گھس جاتے ہیں۔۔۔ ہندی استعارات، اساطیر زیادہ شمار میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ اس سے نظم کی خوبصورتی دوچند ہو جاتی ہے۔"[3]

فہمیدہ ریاض نے "دھوپ" کے ابتدائی مضمون میں خود زبان کو تہذیب کا جز قرار دیا ہے۔ وہ زبان کو تہذیب سے وابستگی کا اہم عنصر تصور کرتی ہے۔ انسانی فطرت میں اپنی مٹی سے لگاؤ موجود ہوتا ہے اور تہذیب اور دھرتی ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے فہمیدہ ریاض یوں لکھتی ہے۔

"بولی انسانی تہذیب کا جزو ہے۔ انسانوں کی محنت کے اشتراک کا دلپذیر حاصل! یہ محنت انسان فطرت پر کرتا ہے۔ اور فطرت آسمانی نہیں زمینی ہے۔ الوہی نہیں مادی ہے۔ زمین، ندی نالے، کھیت کھلیان، وادیاں اور پہاڑ جغرافیائی حقیقتیں ہیں۔ ان حدوں میں رہنے بسنے والے لوگوں کی ہزاروں برسوں کی

مشترکہ تاریخ انہیں قوم کی شکل دیتی ہے۔ معاشرے کی بڑھوت کے ساتھ ساتھ بولی بڑھتی ہے۔ پہلودار بنتی ہے۔ فطرت کو آدمی نے کبھی اپنے وجود کا حصہ سمجھا کبھی اس سے پیار کیا اور کبھی اس کی زورآوری سے خوف کھایا۔۔۔ بولی کا رشتہ تو دھرتی سے بنتا ہے۔ دھرتی ہی بولی کی پہچان ہے۔۔۔ میری زبان کا تعلق بھی ایک دھرتی سے ہے۔ وہ دھرتی جہاں میرے پُرکھوں کی ہڈیاں مٹی میں ملی ہیں۔"[4]

ہندوستان میں آریا کی آمد سے پہلے موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی تہذیب مشہور تھی اور جیسا کہ تہذیب تین طرح سے منتقل ہوتی ہے، ماضی سے حال میں اور حال سے مستقبل میں، تو اس کے اثرات ہمیں آنے والے عہد برصغیر پاک وہند کی تہذیبی ارتقا کے تسلسل میں نظر آتے ہے۔ فہمیدہ ریاض کے مجموعہ "دھوپ" کی پہلی نظم تہذیبی حوالے سے ہندوستانی تاریخ سے گہری وابستگی کی غماز ہے۔ لسانی اعتبار سے اس نظم میں ہندی الفاظ اور تراکیب کی برمار ہے۔ جیسا کہ:

آشاڈور اٹوٹ
جلاتی دیپک رین نراس
لُٹے جب نگر بھروسوں کا
کامنائیں ہو جائیں اداس
کسی کی ایک دھڑکتی جان
کوئی نربل سااِک انسان
جو ٹکرادے نینوں سے نین
ہمیں پھر آجاتا وشواس
آشاڈور اٹوٹ[5]

آشا لفظ سن سکرت کا ہے اور اردو میں مستعمل ہے۔ اسی طرح "کامنائیں" لفظ بھی زیادہ تر ہندی میں استعمال ہوتا ہے۔ شاعرہ کی ہندی سے تہذیبی لگاؤ ہی کی وجہ سے وہ اپنی نظم میں ان الفاظ کا استعمال کرتی ہے۔ فہمیدہ نے ہندوستانی تہذیب کی خامیوں اور خوبیوں دونوں کو اپنی نظم میں پیش کیا۔ وہ جہاں ایک طرف ہندوستانی عورت کا تقدس اور ماں کی عظمت کا بیان کرتی ہے، تو دوسری طرف مشرقی عورت کا المیہ بھی بیان کرتی ہے اور اس المیہ کے بیان میں اس کی نظم بلواسطہ ہندوستانی تہذیب اور مشرقی روایات کا عکس پیش کرتی ہے۔ اگرچہ وہ ان روایات اور رواجوں کی نفی کرتی ہوئی نظر آتی ہے، لیکن اس کی نظم اس بیان میں ایک عہد اور ایک تہذیب کی تصویر کشی کرتی نظر آتی ہے:

ایک لڑکی سے
سنگدل رواجوں کی
یہ عمارت کہنہ
اپنے آپ پر نادم
اپنے بوجھ سے لرزاں
جس کا ذرہ ذرہ ہے
خود شکستگی ساماں
سب خمیدہ دیواریں
سب جھکی ہوئی کڑیاں
سنگدل رواجوں کے
خستہ حال زنداں میں!
اک صدائے مستانہ!
ایک رقص رندانہ!
یہ عمارت کہنہ ٹوٹ بھی تو سکتی ہے
یہ اسیر شہزادی چھوٹ بھی تو سکتی ہے۔(6)

اس نظم میں تہذیبی عکاسی لفظی تاثیر سے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عصری شعور کی غمازی بھی ہے۔ وہ ایک جہاندیدہ خاتون تھی اس لئے اسے معلوم تھا کہ مشرق میں روایات اور رسوم زیادہ تر عورت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے فہمیدہ ریاض نے ایک لڑکی کو سنگدل رواجوں کی قید میں پکارا اور امید گردانی کے یہ شہزادی قید سے آزاد بھی ہو سکتی ہے۔ مشاہدے اور احساس کی دنیا کا تعلق جوڑے رکھا اور بڑی بے باکی سے تجربے اور مشاہدے کو نظم کا روپ دے کر پیش کیا ہے۔ جیسا پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ تہذیب و تمدن میں رہن سہن کے طور طریقے، زبان، رسم و رواج اہم عناصر ہیں۔ یہی عناصر "دھوپ" کی نظموں میں تہذیب کا عکاس بن کر سامنے آتے ہیں۔ نظم "گرستن" جیسا کہ عنوان ہی اپنے اندر تہذیبی جھلک لئے ہوئے ہیں، مشرقی تہذیب اور کلچر کی نمائندہ نظم ہے۔ گھر کے کام کاج عورت سے وابستہ ہیں، خاص طور پر ہندوستان اور پاکستان میں گھروں میں کچن کا کام عورت کی زندگی کا ایک اٹوٹ رنگ ہے اور باورچی خانہ تہذیبی رنگ کا بہترین نمائندہ ہے، کیونکہ کھانے پینے کے لوازمات کلچر اور تہذیب کا ایک خوبصورت حصہ ہے۔ اس کی پیش کش فہمیدہ ریاض ہندی الفاظ اور تراکیب کی پیوند کاری سے کچھ ان الفاظ میں کرتی ہے:

سنگیت کے دائرے بتاتی ہوئی چال
آنگن سے رسوئی کی طرف جاتی ہوئی
اک ہاتھ دھرے کمر کی گولائی میں
چٹکی میں سارا کام نبٹاتی ہوئی
ہنستا بالک ہری بھری گودی میں
سکھ چین سہاگ کا سبھاؤ میں رچا
ہونٹوں پہ چٹکتے ہیں رسیلے بوسے
سب تن سے چھلکتی ہوئی جیون مدُرا[7]

پاکستان، ہندوستان دونوں ممالک میں خواتین اپنے گھریلو کام کاج میں بڑی چابکدستی دکھاتی ہیں، فہمیدہ ریاض نے رسوئی یعنی کچن کا پورا منظر پیش کرتے ہوئے گرستن کا کام کرتے ہوئے سکون کی کیفیت اور اسودگی کا احساس بھی بیان کیا۔ اس نظم میں جہاں روزمرہ زندگی کا کاروبار بیان ہوا ہے وہاں خوبصورت ہندی الفاظ جیسے رسوائی، بالک، بیوپار کا استعمال بھی نظم کے صوتی آہنگ کو نمایاں کرتے ہوئے تاثیر کو بڑھا دیتا ہے۔ تہذیب کے عناصر ترکیبی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ آب و ہوا اور موسم بھی تہذیبی بُنت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض نظم "دھوپ" میں ایک طرف فطرت کے نظام کے مرہونِ منت موسم کی تبدیلی کا ذکر کرتی ہے تو دوسری طرف جذبوں کو خوبصورت احساسات سے منور کر کے پیش کرتی ہے۔ نظم کی صورت آزاد نظم کی ہے لیکن منظر کے بیان اور لفظ کے چناؤ نے اس میں ایک خاص ترتیب پیدا کر دی ہے:

رین تو ٹھنڈی تھی
پر جب دوار کھڑی ہے بھور
بڑھا ہے جاڑا
پڑتا توڑ کا
چُپ گاڑھا اندھیارا کہاں پتہ دیتا ہے
اس پالے میں
اس جاڑے میں
توڑ کا سارا زور لگاتی سسک رہی رین
کوئی پل دو پل میں
پَو لگے گی پھٹنے

نکل آئے گی گرم دھوپ
رے ٹھنڈے اندھیارے![8]

فہمیدہ ریاض نے زندگی، نیچر اور واقعات کو بڑی خوبصورتی سے جوڑا ہے۔ فطرت کے مظاہر کا حسن جہاں شاعر کی نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے وہاں فطرت کی خصوصیات بھی انسانی مزاج کے ساتھ لگا کھاتے ہیں۔ ہم تاریخ کے اوراق میں دیکھیں تو آدم سے لے کر آج تک انسان فطرت کے حسن کا شیدائی ہے اور اس کے نامسائد حالات کا شاکی بھی رہا ہے۔

فہمیدہ ریاض کی نظم میں درجہ بدرجہ ارتقائی عمل جاری و ساری ہے۔ وہ خود بھی انسانی ارتقاء کی جدوجہد میں شامل ہے اور اپنے سماج کی نمائندگی بھی شاعری کی صورت میں کرتی ہے۔ سماج میں ہونے والے ظلم اور ناانصافی کو وہ بڑی بے باکی سے بیان کرتی ہے۔ "پتھر کی زبان" ایک ایسی ہی مزاحمتی نظم ہے جس میں معاشرے میں ہونے والے ظلم کی طرف تو اشارہ ملتا ہے لیکن ساتھ ساتھ فرد کی بے حسی کا نوحہ بھی ہے۔

پتھروں پر دمکتا اکیلا لہو
جھلملاتا لہو، بہہ رہا ہے
میرے بیٹے، یہاں دیدہ ور کون ہے
جو نظارہ کرے
دامن کوہ میں
کیسے چمکے ہیں یاقوت و مرجان
ہم وطن تو کوئی سننے والا نہیں
پتھروں نے سنیں
کرب کی سسکیاں
آخری ہچکیاں
جسم پر پیرہن پارہ پارہ
گولیوں سے بدن پارہ پارہ
بے سہارا لہو بہہ رہا ہے[9]

وہ مظاہرِ فطرت کے حسن کا بیان بھی کرتی ہے اور نظام کی ابتری کا نوحہ بھی روتی ہے۔ وہ انگلی اٹھاتی ہے جہان جہاں اسے انتشار، ناانصافی اور خون و فساد دکھائی دیتا ہے۔ عام طور پر شاعر تاریخی جبر سے فرار ڈھونڈتا ہے اور وقت کے حسن کو تلاشتا ہے مگر ترقی پسندوں نے اور حقیقت نگاروں نے وقت کے رستے ناسوروں

کو موضوع بنایا۔ فہمیدہ نے سیاسی المیوں کو بھی قلم بند کیا جیسا کہ "اکیلا کمرہ" شیخ مجیب کے قتل پر لکھی گئی نظم ہے اس میں سیاسی المیہ بھی ہے اور خوبصورت لفظیات جو جذبوں کی شدت کو بیان کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ فطرت سے وابستہ تشبیہات اور استعارات کا چناؤ بھی کرتی ہے۔

پر اس کمرے سے باہر
گھن گھن بادل گرجا ہے
کیا ٹوٹ کے مینہ برسا ہے
دھندلائی ہوئی ہیں سڑکیں
جیسے کچھ سوچ رہی ہیں
جُگ بیتے سمے نے ڈھالی
چاندی کی نئی کھٹالی
جنموں کے کرم پگھلے ہیں
سب دین دھرم پگھلے ہیں
اب دھرم کا روپ نیا ہے
سارا بہروپ نیا ہے(10)

تہذیب کی بو، فرد کو اپنے حصار میں لیتی ہے اور خاص طور پر شاعر کی شاعری اس کے زمانے اور عہد کا عکس ہوتی ہے۔ فہمیدہ نے انسانی زندگی کے تماشے کو دیکھا، برتا اور اظہار کیا۔ اس کے عہد میں فرد تہذیبی شکست وریخت کا شکار تھا۔ فہمیدہ نے خود بھی اس اضطراب کو محسوس کیا اور اس کا اظہار "دھوپ" کی مختلف نظموں میں بھی کیا۔ "دھوپ" کی نظموں کے حوالے سے شاہ محمد مری لکھتے ہیں کہ۔

"فہمیدہ کا تیسرا مجموعہ "دھوپ" ہے جو اس کی ۱۹۷۳ء سے لے کر ۱۹۷۷ء کی شاعری پر مشتمل ہے۔ اب وہ نظریاتی طور پر مارکسزم سے نہ صرف مکمل آشنا ہوئی بلکہ اس نظریے کے ساتھ وابستہ بھی ہو چکی تھی۔ اردو شاعرات میں شاید وہ اولین ہے جس نے ایک سیاسی سماجی نظام کے طور پر مارکسزم کو قبول کیا۔ یہاں ہمیں جگہ جگہ نظر آتا ہے کہ فہمیدہ استحصال انسانیت کی نجات کے لئے کارل مارکس کے نظریے کو کنجی قرار دے رہی ہے۔"(۱۱)

کارل مارکس پر فہمیدہ ریاض نے بڑی خوبصورت نظم لکھی اس میں بھی ہندی لفظیات کا حسن موجود ہے، ساتھ ہی میں فہمیدہ کی کارل ماکس کے لیے عقیدت اور احترام بھی جھلکتا ہے۔

نہ وہ کوئی اوتار پیمبر، نا جگ کا رکھوالا

اپنے جیسا اک انسان تھا گھبری داڑی والا

کالی دھرتی پھاڑ کے سورج جہاں جہاں نکلا ہے
آدمیوں نے تڑپ تڑپ کر تیرا نام لیا ہے
یوں تو سے رُکے نہیں روکے، پر ایسا بھی ہوا ہے
اُڑتی صدی نے پل بھر تھم کر مڑ کے تجھے دیکھا ہے
اک انسانی نسل نے تجھ کو رہ رہ کر سوچا ہے
ایک نسل نے ہاتھ اٹھا کر تجھے سلام کیا ہے (۱۲)

عورت کے احساسات اور جذبات کو بیان کرتے ہوئے وہ ایک ماں کے جذبات کو اپنی نظم "لوری" میں سموتی ہے۔ "لوری" مشرقی تہذیب کا ایک مضبوط حوالہ ہے، جو ہر کلچر کا خاصا ہے۔ یہ نظم بھی آزاد ہئیت میں لکھی گئی ہے اور ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ علم البیان و بدیع کی خوبیوں سے بھی مرصع ہے۔ ماں اپنے پیارے راج دلارے کو دیکھ کر کھل اٹھتی ہے اور اس کو سلاتے ہوئے اپنے جذبوں کو، خود کو اپنے بچے پر نچھاور کرتی ہے:

لوری

اری تیرا چاند مکھڑا
مری جان کا یہ ٹکڑا
دیکھتی ہی جاؤں ری
نین میں بساؤں ری
تجھ کو اپنی بانہوں کا جھولنا جُھلاؤں ری (13)

ساون کا مہینہ شعراء کے لیے بہت سی امیدوں اور تمناؤں کے بھر آنے کا موسم ہوتا ہے۔ خاص طور پر محبت کے جذبوں کا بیان اور محبوب سے وصل کے لئے بے تابی اس موسم میں بڑھ جاتی ہے، مگر ہمارے ہاں ناری بہت سی خواہشات کی تکمیل کے لیے ساون کے مہینے کا انتظار کرتی ہے جو محبوب کی آمد کا موسم قرار دیا جاتا ہے۔ اکثر فراق میں گرفتار ساون بن ساجن بیت جانے کا شکوہ ملتا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے اپنی نظم "ساون بیت گیا" میں کچھ ان کیفیات کا بیان کیا ہے جو کہ مشرقی تہذیب سے وابستہ محبت کا بھرپور حوالہ ہے۔

ساون بیت گیا
آیا کاتک
بیتا جیٹھ

روکھا چیت گیا
ساون بیت گیا[14]

فہمیدہ ریاض نے نسوانی جذبات اور احساسات کو بہ خوبی اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ ایسی کیفیات کو بیان کرتے ہوئے وہ جانے انجانے میں ہمارے ارد گرد پھیلے مختلف لوگوں کی کہانی سناتی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ ہماری تہذیب کے رنگوں کو ان رشتوں، ان کیفیتوں میں پروتی جاتی ہے۔ اس کی ایک اور خوبصورت مثال نظم "ایک بہت ہی سیدھی بات" ہے۔

ایک بہت ہی سیدھی بات
ہر ناری کے من میں چھپی ہے ایک پرانی ابھیلاشا
من چاہے مُنش کے ساتھ پھرے، گھومے
بارش میں بھیگے
سردی سے کانپے
گرمی جھیلے
مٹی کو بھی بھید بتائے
ناری کو شرمیلا کہنے والوں کو شرمائے
اور سوچے اپنی کوکھ میں پلنے والے جیو کا نام![15]

اس مجموعہ میں فہمیدہ ریاض نے گیتوں اور نظموں میں خالص ہندوستانی لفظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر استعمال کئے اور یہ ثابت کیا کہ بولی اور زبان تہذیب کا ایک اہم جز ہے۔ اس لحاظ سے نظم میں فطرت اور موسم کا بیان بھی کچھ ایسی خوبصورتی سے کرتی ہے کہ ہندوستانی تہذیب کے نمونے آنکھوں کے سامنے حرکت کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ ماضی سے رشتہ جوڑتی ہے اور لوک شاعری کی بازیافت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ دھوپ کی ہر نظم لسانی اور تہذیبی حوالے سے بھرپور انداز میں ہندوستان کے کلچر کی تصویر کشی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، کراچی، ص ۴
۲۔ مضمون از برہان احمد فاروقی، مشمولہ اسلامی تہذیب و ثقافت، ص ۱۴۶
(اسلامی تہذیب کا نصب العین)
۳۔ شا محمد مری، ایک چھوٹی سی کتاب کی دیوانی، انسٹیٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، ص ۱۴، ۲۰۳۰ء
۴۔ فہمیدہ ریاض، دھوپ، مکتبہ دانیال، کراچی، ص ۹ تا ۱۰/ اکتوبر ۱۹۸۹ء
۵۔ ایضاً، ص ۱۳
۶۔ ایضاً، ص ۲۱
۷۔ ایضاً، ص ۲۴
۸۔ ایضاً، ص ۲۸
۹۔ ایضاً، ص ۳۱
۱۰۔ ایضاً، ص ۳۹
۱۱۔ شا محمد مری ، ایک چھوٹی سی کتاب کی دیوانی، انسٹیٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، ص ۳۰، ۲۰۱۴ء
۱۲۔ فہمیدہ ریاض، دھوپ، مکتبہ دانیال، کراچی، ص ۴۳ تا ۴۴، اکتوبر ۱۹۸۹ء
۱۳۔ ایضاً، ص ۵۲
۱۴۔ ایضاً، ص ۷۰
۱۵۔ ایضاً، ص ۷۹